رخسانہ بی بی
لیکچرر، شعبہ اُردو
جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

# ''غلام باغ'' میں کارفرما تاریخی تصورات

GhulamBagh,anovel byMirzaAtharBaig is different from other Urdu novels. Its scope is very wide. It is the reflection of author's foresightedness about the old civilization. It extends postcolonial discourse in Urdu. It was difficult to differentiate between the ruler and the ruled. It gives a deep insight into political, social and cultural problems of that time. All the historical concepts of this novel have been discussed in this research article.

کسی بھی زبان کے نثری ادب میں ناول کی بہت اہمیت رہی ہے۔ ناول کسی ملک کی تہذیب، تمدن، انداز فکر کا مورخ ہوتا ہے اور ہمیں سابقہ تاریخ کے متعلق جاننا ہو یا حال کے بارے معلومات حاصل کرنی ہوں ناول سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ اس میں زندگی میں پھیلے حقائق کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

اُردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد سے اُردو ناول کا آغاز ہوتا ہے مرزا ہادی رسوا سے ہوتے ہوئے عزیز احمد، کرشن چندر بعد میں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، بانو قدسیہ وغیرہ نے ناول کے میدان میں طبع آزمائی اور نئے تجربات کے لئے اس کی روایات کو بڑھایا۔ پچھلے کچھ عرصہ سے اُردو ناول کی روایت ماند پڑتی نظر آرہی تھی لیکن ۲۰۰۶ء اُردو ناول کے لیے خوشگوار ثابت ہوا۔ جس میں 'کئی چاند تھے سر آسماں' اور 'غلام باغ' جیسے اعلیٰ ناول تخلیق ہوئے جو بلاشبہ اُردو ناول کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کا باعث بنے۔

''غلام باغ'' عام ڈگر سے ہٹا ہوا ناول ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ آثارِ قدیمہ سے متعلق مصنف کے تخیل کی پیداوار ہے۔ اس میں نو آبادیاتی معاشرے میں سرگرم عمل کرداروں میں سے کچھ کے اعصابی اختلال کا ذکر کرتے ہوئے اس پاگل پن کا سراغ لگایا گیا ہے جو کسی کو محکوم اور غلام اور کسی کو آزاد اور مقتدر بتانے میں معاونت کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان:

> ''اُس میں ماضی کی آسیبی پرچھائیاں حال کی بے ترتیبی اور مستقبل ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ اس تصادم سے جو شور پیدا ہوتا ہے وہ ہماری موجودہ عصری کیفیت کا شور ہے۔ نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد چاروں طرف سے گھیرے ہوئے بڑے بڑے جال ان میں گرفتار خلقت کا اضطراب اور انتشار اور اس انتشار میں زندگی کی معنویت کی تلاش کی بے سود کاوشیں۔ یہ سب کچھ اس ناول کا 'پوسٹ کولونیل' دائرہ متعین کرتا ہے۔''[1]

''غلام باغ'' اپنے مقام میں اُردو ناول کی روایت سے قطعی مختلف اور ہٹ کر ہے بلکہ جو تکنیک اس میں استعمال ہوئی ہے وہ انگریزی میں بھی نہیں ملتی البتہ اس میں فرانسیسی ادب کی چھاپ دیکھی جاسکتی ہے۔ ناول کی کہانی نہ تو ایک منظم طریقے سے بیان کی

گئی ہے اور نہ ہی جذبات کے بہاؤ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ اس کے پلاٹ اور کرداروں میں ربط نہیں اور بطور ناول اپنی ہیئت میں کئی روپ دھارتا ہے کہیں Antinovel کے زمرے میں آتا ہے کہیں مکتوبی ناول کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہیں مرکزی کردار مبصر کرداروں کا سوانگ رچاتے ہیں۔

اس ناول میں ماضی کی غلطیاں ہیں۔ حال میں کچھ صحیح کرنے کی خواہش ہے ۔مستقبل مفروضے پر قائم ہے بدی اور نیکی کی جنگ ہے۔ یہ ایک مرد کی جدید دور میں مشکل اور ناخوشگوار حالت کو ظاہر کرتی ہے اس کو کسی حد تک خود کلامیوں کے ملاپ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ۔ اس میں کرداروں کے درمیان کوئی ربط بات چیت نہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعلق رکھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اس محر العقول، نرالی اور عجیب وغریب مضحکہ خیز صورت ہائے احوال کے ذریعے زندگی کے المیوں اور لایعنیت کی عکاسی کی گئی ہے۔ بقول عبداللہ حسین:

> ''ناول کی کہانی شیشے کی مانند ہے جو چاروں جانب گھوم رہا ہے کبھی اس میں جنگل کا عکس آتا ہے کبھی بے کنار سمندر اور چاند ستاروں کا نظارہ ملتا ہے اس پیسا بائسکوب کی طرح جس سے بچپن میں ہم آنکھ لگا کر شوخ رنگ شیشوں کی مختلف بنتی ہوئی شکلیں اور بمبئی کی سیر اور بارہ من کی دھوبن دیکھا کرتے تھے۔ اس کی مثال میں جدید ڈاکومنٹری کی تکنیک سے دوں گا جسے Cinemavenite کہتے ہیں جس میں ڈائریکٹر کیمرہ ہاتھ میں پکڑ کر روزمرہ زندگی کے عام منظر ریکارڈ کرتا ہے اس میں کئی مناظر کی ایک دوسرے سے کوئی مطابقت نہیں آتی، تاہم پوری فلم دیکھنے کے بعد ایک اکائی کی صورت میں ابھرتی ہے اس طرح غلام باغ کو مکمل طور پر پڑھنے کے بعد ناول کے نقشے کا توازن واضح طور پر سامنے آتا ہے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اس کی تہہ میں غیر محسوس طور پر ناول کے فلسفے کی رو، گو یا ریڑھ کی ہڈی کی طرح چلتی ہے جو اسے توانائی عطا کرتی ہے۔''[۲]

''غلام باغ'' میں تاریخی تصورات کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کا پس منظر تاریخی ہی ہے۔ اگرچہ یہ موجود زمانے میں ہے لیکن اس کی کہانی نو آبادیاتی پس منظر کو بیان کرتی ہے۔ اس میں موضوع ہی یہی ہے کہ نو آبادتی صورتِ حال سے نکلنے کے بعد آج بھی ہم اسی ماحول میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس پر تفصیل سے بات کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ نو آبادیاتی صورتِ حال یا نظام ہے کیا؟

۱۸۵۷ء کی جنگ نے ہماری تاریخ کو ہی نہیں ہمارے تاریخی شعور کو بھی بدل کے رکھ دیا۔ اِس کے بعد نہ صرف ہندوستان کے باشندے نئے عہد میں شامل ہوئے بلکہ خود اور دوسروں کو نئے زاویوں سے دیکھنے لگے۔ یہ زاویے ہم نے خود تخلیق نہیں کیے بلکہ خود نئی تاریخ نے انہیں تھما دیے تھے اور یہ عمل اِس لمحے میں ہوا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اِس غیر معمولی انقلاب کو محض عسکری طاقت نے ممکن نہیں بنایا بلکہ وہ تو ایک وسیلہ تھی اصل یہ کہ مذکورہ انقلاب کو جس چیز نے ممکن بنایا وہ نو آبادیاتی صورتِ حال تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال کیا ہے؟ نو آبادیاتی صورتِ حال فطری یا منطقی صورتِ حال نہیں ہے یہ از خود کسی قابل فہم فطری قانون کے تحت رونما نہیں ہوتی بلکہ اس کو 'پیدا' کیا جاتا ہے اور تشکیل دیا جاتا ہے اور اس کو استعماری قوتوں انگریزوں

نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے تشکیل دیا۔ ناصر عباس نیر اس بارے میں تبصرہ کرتے ہیں:

''یہ انسانوں کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں مخصوص مقاصد کی خاطر برپا ہونے والی صورتِ حال ہے اس گروہ کو نو آباد کا نام دیا گیا ہے نو آباد کار بعض تاریخی قوتوں کو اپنے اختیار میں لاکر ایک نئی تاریخی صورتِ حال کی تشکیل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جو اِس کے سیاسی اور معاشی مفادات کی کفیل ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک نو آباد کار یورپی (برطانیہ اور فرانس بالخصوص) تھے۔'' [۳]

چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نو آباد کار یورپی طاقتیں ہیں برصغیر میں نو آباد برطانوی تھے اور انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے نو آبادیاتی صورت پیدا کی اور برصغیر کے باشندوں کو اپنا محکوم بنایا۔ اس طرح دو دُنیائیں وجود میں آئیں ایک نو آبادکاروں کی دنیا اور دوسری دنیا نو آبادیاتی باشندوں کی دُنیا اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ نو آبادکاروں نے اپنی شخصیت، اپنی ثقافت، اپنے علمی ورثے اور اپنے سیاسی نظریات کے ذریعے نو آبادیاتی افراد کی تہذیب و ثقافت کو بے دخل کرنے کی کوشش کی۔

اس طرح نو آبادیاتی دنیا اس سے بری طرح متاثر ہوئی اور اس محرومی کا ادراک مقامی باشندوں نے دو صورتوں میں کیا محرومی کے خاتمے کی صورت میں اور محرومی کے سبب کی صورت میں پہلی صورت انگریزوں کی دُنیا کو جذب کرنے کی کوشش کی اور دوسری صورت میں اس سے بغاوت کی لیکن دونوں صورتوں پر نو آبادکار کی دُنیا کے اخراج سے قاصر رہی۔ اس کی کیا وجہ تھی اس بارے میں ناصر عباس نیر کا کہنا ہے:

''نو آبادیاتی دُنیا کی دو میں تقسیم کا اختیار نو آبادکاروں کے پاس ہوتا ہے۔ نو آبادکار محض اس تقسیم کے ذریعے اپنے اختیارات کا مظاہرہ ہی نہیں کرتا، اس تقسیم کے نتیجے میں اپنے اختیار کو بڑھاتا بھی ہے۔ یہ تقسیم طبعی اور زمینی، بیک وقت ہوتی ہے۔ نو آباد کار اپنی اقامت گاہوں، چھاونیوں، دفاتر کو مقامی باشندوں سے الگ رکھتا ہے اور مقامیوں کو ان کے قریب بھٹکنے کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے۔ ''کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے'' کی تختی جگہ جگہ آویزاں ہوتی ہے ..... نو آبادکار، نو آبادیاتی دُنیا کو دو میں تقسیم ہی نہیں کرتا۔ نو آبادیاتی دُنیا کو تشکیل بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نو آبادیاتی باشندوں کی دُنیا ان کی اپنی دُنیا نہیں ہوتی، انہیں اپنی دُنیا پر کوئی تصرف اور اختیار نہیں ہوتا نہ اس دنیا کے حقیقی، عملی معاملات پر اور نہ اس دنیا کے تصور اور اس کے نظام اقدار پر، وہ اپنی ہی دنیا میں اجنبی اور اس سے باہر ہوتے ہیں۔'' [۴]

نو آبادیاتی باشندہ جب اس صورتِ حال سے گزرتا ہے تو دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا تو اس نو آبادیاتی صورتِ حال کو قبول کرتا ہے یا پھر بغاوت کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے بقول:

''انجذاب کے عمل میں نو آبادیاتی باشندہ نو آبادکار کی زبان سیکھتا ہے اس کا لباس اختیار کرتا ہے اس کے طرزِ بود و باش کی نقل کرتا ہے نقل و تقلید میں وہ جتنا آگے جاتا ہے۔ اپنی تاریخ، ثقافت اور اپنی اصل سے اتنا میں دور چلا جاتا ہے۔'' [۵]

ایسے انسان چند مادی فوائد کی خاطر اخلاقی طور پر گر جاتے ہیں اور اپنی پہچان کھو دیتے ہیں۔ اس میں جو لوگ بغاوت کرتے ہیں تو وہ نو آباد کاروں کے مکمل جبر میں ہوتے ہیں اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح ایسے لوگ 'کبیر' کی طرح ذہنی مریض بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ناول میں نو آبادیاتی دور اور پھر اِس سے نکلنے کے بعد آج کا انسان جس انتشار افراتفری پر اور ذہنی تناؤ کا شکار ہے اس کا بیان اس ناول میں ملتا ہے اور بنیادی طور پر یہ ناول اس پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں کبیر کا کردار باغی کا کردار ہے جو نو آبادکاروں کے شکنجے سے آزادی کا متلاشی ہے وہ پھڑ پھڑاتا ہے اور اس کی پھڑ پھڑاہٹ کی یہ کوشش بے سود ہے۔

دوسری طرف امبر جان، نواب ثریا یا جنگ اور غیاث پگل جیسے لوگ ہیں۔ جنہوں نے اس صورتِ حال کو جذب کیا اور وہ بظاہر تو امراء اور شرفا میں شمار ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً بہت رزیل ہیں۔ اس صورتِ حال کا انوکھا بیان اس ناول میں ملتا ہے۔

اس میں واقعات مکالموں اور خود کلامی کی ایک ایسی دنیا سجائی گئی ہے جو اگرچہ اُردو ناول میں اس سے پہلے ناپید تھی لیکن اِس کے ذریعے نو آبادتی دور سے پہلے اور اس کے بعد کی زندگی کا نقشہ بہت انوکھے انداز سے کھینچا گیا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> '' نو آبادیاتی دور سے قبل نیز نو آبادیاتی دور کے بعد ہمارا منظر نامہ، جنوں، پاگل پن، ہر معاملے میں انتہا پسندی عدم برداشت، فضول کی جنگوں، نفرتوں، تعصّبات اور ہمہ گیر انتشار سے عبارت رہا ہے اور آج کے دور کا جنون تو سب پر بازی لے گیا ہے۔''[۶]

اس ناول کا پلاٹ اگرچہ منظّم نہیں اس میں علامتوں اور کردار کے بیانیہ انداز اور ان کی حرکتوں سے تاریخ کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اس میں واضح تاریخ نہیں ملتی۔ اس میں اشاروں اور علامتوں کے ذریعے نو آبادیاتی سوچ کو ظاہر کیا گیا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی میں جو طبقات پیدا ہوئے ہیں ان کی سوچ کے بارے میں اس ناول میں بتایا گیا ہے کہ ان کی سوچ کیا تھی ان کی سوچ کا ٹکراؤ، کشمکش، تصادم، واضح طور پر سامنے آتے ہیں اور علامتوں اور اشاروں سے تاریخی حوالے ملتے ہیں یہ اشارے مبہم بھی ہیں اور کئی جگہ بھٹکا دینے والے بھی ہیں۔

'غلام باغ' ناول کا عنوان سب سے بڑا تاریخی حوالہ ہے۔ مرزا اطہر بیگ انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> '' غلام اور 'باغ' ایک دوسرے کی ضد بنتے ہیں۔ باغ زندگی کی علامت ہے اور 'غلام' غلبہ اسیری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی صورتِ حال ایک سطح پر تمام ناول کی فضا بنتی ہے بنیادی طور پر اہم بات جو ہے انسان کا انسان پر غلبہ حاصل کرنا اور دوسرے انسان کو محکوم بنانا اس ناول میں اسی بات کو موضوع بنایا گیا ہے اور اس کی وسیع تر Dimention کو Explore کرنے کی کوشش کی گئی ہیے۔ اس کی ایک سطح افراط کی بھی ہے جو کرداروں کی آپس میں کشمکش میں ملتی ہے اس سے بڑھ کر اس کے پیچھے جو سارا پس منظر اسی غلبہ پانے اور اندھی قوت حاصل کرنے کی خواہشیں پہلے اور پھر ہمارے پوسٹ کونسل کلونیل نظام کا پس منظر جو یورپین اقوام کے آنے کے بعد وجود

میں آیا اس کے اشارے بھی موجود ہیں اور اگر دیکھا جائے تو یہی بنیادی موضوع یہ جس کی تمام سطحوں کو Explore کیا گیا ہے۔ ۷

'غلام باغ' استعارہ ہے ایک ایسے ملک کا جو استعماری شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کے با اختیار لوگ جو میں وہ بھی اپنے فیصلوں میں اپنی زندگی میں با اختیار نہیں وہ بھی غلام ہیں اپنی سوچ کے اپنے 'نفس' کے وہ اپنی ہوس میں چیزوں کو دیکھتے ہیں۔

'غلام باغ' سے ملنے والے پرانے آثار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ تہذیب صدیوں پرانی ہے لیکن اس تہذیب کی اہمیت زمانہ حاضر کے مطابق کچھ نہیں اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں اور جب غلام باغ میں موجود 'جنم کھنڈ' کی کھدائی کی جاتی ہے تو اس سے جو چیزیں برآمد ہوتی ہیں وہ بھی خفیہ طریقے سے باہر کے ممالک میں برآمد کر دی جاتی ہیں۔ غلام باغ کو اگر پاکستان کا استعارہ سمجھیں تو اس میں نواب ثریا کا کردار استعارہ ہے۔ نواب ثریا جانا درجنگ کا کردار جو سارے باغ کو اپنی ملکیت قرار دیتا ہے اور اس ملکیت کے چکر میں اس باغ کو ہتھیا لینا چاہتا ہے وہ ہماری اس اجتماعی سوچ کی نشاندہی کرتا ہے اور ہماری اس اجتماعی سوچ کا اظہار ہے جس میں ہم اپنے ذاتی مفاد کے لیے تمام اجتماعی اور قومی مفادات کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

> ''ایک زمانہ تھا جب غلام باغ کو بڑے شہر کے مضافات میں واقع آثار قدیمہ میں شامل کیا جاتا تھا پھر جب بڑا شہر اور بڑا ہوتا گیا تو باغ پورے شہر کی لپیٹ میں آ گیا مضافات پیچھے ہٹتے چلے گئے پھر تو یہ حال تھا کہ محکمہ آثارِ قدیمہ کے لیے عہد قدیم کی اُس یادگار کو آبادی کے رہائشی دباؤ سے بچانا مشکل ہوگیا اور غلام باغ کے بیرونی کنارے اکثر ملکیتی دعوؤں کی حریصانہ زد میں آتے رہتے تھے۔'' ۸

اس طرح کئی مقدمے چلتے رہتے تھے با اثر نواب ثریا جاہ درجنگ نے اس باغ پر اپنی ملکیت ظاہر کر دی اور عدالت میں کیس پہنچ گیا اور وہ مقدمہ جیتنے والا ہی تھا کہ گوروں نے یہ عالمی ثقافت نجی ملکیت بنتے دیکھ کر اور باقی لوگوں کا احتجاج سن کر اس کو کچھ خصوصی مراعات دے کر قائل کر دیا:

> ''تہذیب یافتہ اقوام کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے سکھ کا سانس لیا اور غلام باغ پر اپنی تحقیقات اور بھی شد و مد سے شروع کر دیں کیونکہ وہ سبھی اور اُن کی پیروی میں مقامی عالم بھی اس بنیادی نظریے پر متفق تھے کہ غلام باغ دنیا کے اس خطے میں واقعہ آثارِ قدیمہ کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے اور عجب معمہ ہے۔'' ۹

نواب ثریا جاہ نادر جنگ اگرچہ اب صحیح معنوں میں جاگیردار نہیں رہا اس نے صرف چوغہ پہنا ہوا ہے سوائے ظاہری خلعت اور چند موتیوں کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'غلام باغ' کو اپنی ملکیت بنانے کے لیے کوشاں ہے یہ کردار خوابیدگی کی علامت ہے۔ یہ کردار ظاہر کرتا ہے کہ ہم حقیقت کے اندر آنے والے تغیر کو برداشت اور قبول نہیں کرتے اگر وہ ہمارے خلاف جا رہا ہو۔

**نواب ثریا جاہ:** اس ناول میں سب سے بڑا تاریخی حوالہ نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد کے نوابی طبقے ہیں جو صرف نام کے نواب ہیں اس کی زندگی میں حقیقت سے جی چرانے کی کوشش ملتی ہے اور یہ بات تب واضح ہوتی ہے جب زہرا اپنے گھر میں اسے

تھپڑ مارتی ہے اس وقت اس کی نوابی ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس میں انتقامی سوچ بیدار ہوتی ہے اور وہ باقاعدہ زہرا، ہاف مین اور کبیر وغیرہ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ ہاف مین کا اس کے ساتھ مرنے سے پہلے کا مکالمہ اس کی اصلیت اور آج کے نوابوں کی سوچ کے بارے میں پتہ لگانے کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مثلاً ہاف میں اور نواب ثریا جب بات چیت کر رہے ہوتے ہیں اور ہاف میں یاور عطائی کی مبہیات کا کچھ خزانہ نواب سے لینا چاہتا ہے اور نواب ٹال رہا ہے اس کی ہر بات کو لیکن ہاف مین اسے بتاتا ہے کہ وہ سب پس منظر اس خزانے کا جانتا ہے پھر اس کو فسانہ کیسے مان لے تو نواب کہتا ہے:

''میرے دادا کہتے تھے کہ حد سے آگے جانے کی خواہش کرنا ہلاکت میں ڈالتا ہے ایسی جانکاری سے بچ جانا چاہیے۔'' [۱۰]

**جنم کھنڈر**' غلام باغ' میں موجود 'جنم کھنڈر' بھی ایک پر اسرار تاریخی آثار لیے ہوئے ہے۔ ہاف مین اپنے تحقیقی مقالہ 'غلام باغ کا معمہ' میں ایک جگہ لکھتا ہے:

'' یوں تو 'غلام باغ' میں موجود سب تاریخی آثار اپنے چھوٹے بڑے اسرار لیے کھڑے ہیں یا رفتہ رفتہ گر رہے ہیں مگر سب سے بڑے اسرار اس تاریخی ساخت میں ہیں جو جنم کھنڈر کے نام سے پہچانی جاتی ہے 'جنم' ہندی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی پیدائش کے ہیں جبکہ 'کھنڈر' برباد شدہ عمارت کا ایک لفظی ہندی مترادف ہے اس لحاظ سے یہ ترکیب Paradoxical ہے جنم زندگی اور نمو کی علامت ہے جبکہ کھنڈر خواہ کسی عمارت کا ہی کیوں نہ ہو وقت کے ہاتھوں آخر کار مٹ جانے کا استعارہ ہے اور موت کا پیغام ہے تاریخ میں کوئی مستند حوالہ نہیں ملتا جو اس ترکیب کی وجہ تسمیہ واضح کرنے کا دعویٰ کر سکے۔ اساطیری روایات جیسا کہ اس طرح کی صورتِ احوال میں اکثر ہوتا ہے بہر حال موجود ہیں اور یہ روایات اصل 'جنم' اور کھنڈر کے دونوں ہندی الفاظ کے درمیان کوئی نہ کوئی رشتہ ڈھونڈ نکالنے کی کوششیں ہیں جو بعض اوقات خاصی مضحکہ خیز شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں۔'' [۱۱]

ناول میں 'جنم کھنڈر' کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ چندر گپت موریہ کے دور میں جنم کھنڈر والی جگہ پر اس کے ایک باجگذار کا محل مہا پدم کہلاتا تھا۔ سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس کے قابل ترین جرنیل سلیوکس نکوماکس نے چندر گپت پر حملہ کیا۔ مہاپدم نے در پردہ اس کی حمایت کی سلیوکس کو شکست ہوئی اور چندر گپت کو مہاپدم کی غداری کا پتہ چل گیا لہٰذا اسے سخت سزا ہوئی اس کی رانی حاملہ تھی اور وہ دیوتاؤں سے انصاف کی طالب ہوئی۔ ایک رات اس نے بچہ جنم دیا جو انسان نہیں بلکہ راکھش تھا پیدا ہوتے ہی وہ اتنا دیو قامت ہو گیا کہ محل کی دیواریں اسے سمیٹ ہی نہ سکیں اور رانی کی خواب گاہ کے علاوہ سب کچھ برباد ہو گیا۔ یہ خواب گاہ جنم کھنڈر ہے لیکن یہ کہانی حقیقت پر مبنی نہیں لگتی کیونکہ چندر گپت بیس بائیس سال تک حکمرانی کرتا رہا اور اس بارے میں اہم ترین تاریخی ماخذ موجود ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ غلام باغ جس جگہ موجود ہے وہاں موریا تعمیر کی موجودگی حیرت انگیز بات ہے۔ اسی طرح اس ناول میں جنم کھنڈر سے وابستہ اور بھی بہت سی روایتیں بنائی گئی ہیں مثلاً:

'' جنم کھنڈر سے وابستہ کچھ اور روایتیں اس جگہ مدفون کسی خزانے کا بھی پتہ دیتی ہیں جو کسی سنہرے صندوقچے میں بند

ہے اور جس کی حفاظت کوئی سانپ کر رہا ہے ..... یہاں تو بعض خوش عقیدہ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔'' [۱۲]

'جنم کھنڈر' کا تعلق 'ارزل نسلوں' سے بھی جوڑا گیا یہ کہ ارزل نسلیں جنم کھنڈر جیسی جگہ پر ہی رہتی ہیں ان کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ جنم کھنڈر میں جو کوئی بھی آتا ہے وہ تباہ برباد ہو جاتا ہے۔ جنم کھنڈر کو کھوجنے والے خود کھنڈر بن جاتے ہیں۔ ہاف مین جو کہ جنم کھنڈر کا معمہ حل کرنے آیا تھا، اس کی دریافت کرنے آیا تھا۔ ایک دن خود اس جنم کھنڈر میں دب کر کھنڈر بن گیا۔

دوسرا حوالہ یہ بھی ہے کہ 'جنم کھنڈر' کا تعلق ماضی سے ہے اور ماضی کو کریدنے سے کچھ نہیں ملتا بلکہ اس کو کھوجنے والا خود ماضی کا حصہ بن جاتا ہے۔ نواب بھی جنم کھنڈر کو ملکیت سمجھتا تھا اس میں دفن ہو گیا۔

مدد علی جو کہ بیرے عاشق علی کا بھائی تھا اور نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا خاص نوکر جو غلام باغ سے اس کے لیے خزانہ ڈھونڈتا ہے اس کا معمہ بھی عجیب طرح کا ہے۔ غلام باغ کی اصلیت ایک خزانہ ہے جو صندوق میں بند ہے اور جس کے اردگرد سانپ بیٹھا ہوا ہے۔ اس بارے میں مدد علی بھی دعویٰ کرتا ہے اور وہ بھی ان خوش عقیدہ لوگوں میں سے ہے جو اس خزانہ والی بات کو آنکھوں سے دیکھنے کے دعوے دار ہیں۔

ناول میں جب مدد علی سنہری صندوق کی تلاش میں جنم کھنڈر کے زینے اُتر کر نیچے جاتا ہے تو اس کا سامنا شاید بہت تلخ حقائق سے ہوتا ہے اور وہ صدمے میں آجاتا ہے اور بعد میں وہ چاروں مرکزی کرداروں کی زبان بولنے لگ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ چار پہلو اور یہی غلام باغ کی حقیقتیں ہیں۔

**ارزل نسلوں کی اساطیر:** ایک اہم واقعہ جس سے ناول کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے وہ ایک انگریزی کتاب ہے۔ مصنف گلبرٹ والٹن ہے اس کے پیش لفظ کا کچھ اقتباس اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔ گلبرٹ اور اس کے دوستوں میں بحث ہوتی ہے کرنل پیٹرک بدتمیزی کی حد تک بلند آواز میں کہتا ہے:

''ارزل نسلوں کی کوئی اساطیر نہیں ہوتی۔'' [۱۳]

اس بات پر سب لوگ بہت حیران ہوتے ہیں اور ایک علمی سناٹا چھا جاتا ہے۔ پیٹرک مزید وضاحت کے لیے کہتا ہے:

''اساطیر کی تشکیل، بُنت، تخیل، افضل اور غالب اذہان کے حصے میں آتا ہے کیونکہ اساطیر کا ارتقائی مقصد بھی ارزل نسلوں پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔'' [۱۴]

بیرمیور اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ افضل اور ارزل کی اساطیر میں ساختیاتی فرق تو ہو سکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ان کی کوئی اساطیر نہیں ۔ یہ لغو بات ہے اس بحث سے گورے فیصلہ کرتے ہیں کہ ہندوستان جا کر تحقیق کی جائے اور وہ مانگر جاتیوں کے گاؤں جاتے ہیں پھر اچانک ناول کا تعلق جدید زمانے سے جوڑا گیا ہے اور اس کے چار اہم کردار منظر عام پر آتے ہیں۔ جن میں

مرکزی کردار کبیر کا ہے پھر زہرا جو عطائی کی بیٹی ہے یہ دونوں بھی ارزل نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ پھر ناصر اور ایک انگریز ہاف مین ۔ سید سفیر حیدر رقمطراز ہیں:

''غلام باغ کا پوسٹ کلونیل بہت دلچسپ ہے غلام باغ میں اپنی نباتات تک ختم ہو جاتی ہیں اور آزادی غلام آقاؤں کی زمین کے پودے تک درآمد کر لیتی ہے پھر اپنی ماں بولی کی کیا حیثیت ۔''[۱۵]

یاور عطائی جو کہ ارزل نسلوں سے تھا اس کے باپ کی کہانی ایک اہم تاریخی حوالہ ہے یاور عطائی کو موت کی رات خادم حسین اپنے خاندان کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح وہاں کے امیر پگل خاندان نے ان سے زیادتیاں کیں اپنی زندگی کی پوری داستان سناتا ہے۔ خادم حسین بھورے بخارکی زد میں ہے۔ یہاں پر لفظ ''بھورا'' ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ بھورے کا تعلق زمین سے جوڑا گیا ہے یعنی وہ لوگ زمین میں پیدا ہوتے ہیں اور زمیں میں ہی کیڑوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ان کی زندگی زمین پر رینگنے والے کیڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔غلام باغ میں آقاؤں کی زبان بولنے پر سزائے موت ٹل جاتی ہے:

''مستعفی ماسٹر نے رحیم چوہدری کو اس کے گھر کے سامنے چھریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اسے پھانسی کی سزا ہوئی مگر اس پر بڑے انگریز جج نے جب ملزم سے انگریزی کے کچھ صحیح جملے گرائمر کے فقرے سنے تو خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اُس نے پھانسی کی سزا کو کالے پانی میں بدل دیا۔[۱۶]

اس اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نو آبادیاتی دور میں ہم غلام تھے اور انگریز قوم نے ہمیں محکوم بنایا ہوا تھا اور آج اگرچہ آزاد ہیں لیکن غلام ہے اپنی سوچ کے ہماری تاریخ محکومیت پر بنیاد کرتی ہے کہ ہم نفسیاتی طور پر غلام ہیں استعماری قوتوں نے ہمیں آزادی کے بعد بھی جکڑا ہوا ہے ہماری سوچ کو اور ہمیں نفسیاتی طور پر غلام بنایا ہے۔ ہم غلام زمین کے مالک ہیں ہمیں نئی بات کرنا نہیں آتا ہم نئی بات کرتے ہیں تو کسی پرانی بات کی آر میں۔ ہم صاف شفاف لفظوں میں کوئی بات نہیں کر سکتے۔

ہم غلامی سے آزادی مانگتے ہیں لیکن ایک طرف آزادی کے غلام بھی تو ہیں ہم پوری کوشش کرتے ہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں یقیناً یہ بات واہمہ لگتی ہے کہ ہوسکتا ہے جیسے ہم آزادی سمجھتے ہوں وہی ہماری غلامی ہو ہم غلام سوچ، غلام ذہن اور غلام خیالوں کے لوگ ہیں اور ہماری ذات 'غلام باغ' ہے۔

یاور عطائی زہرا کا باپ اپنے باپ کے خاندان پر کیے گئے مظالم سننے کے بعد باپ کی دی ہوئی کتاب (نسخہ) گنجینہ نشاط شہر لے کر آتا ہے اور بدلا لیتا ہے اپنے خاندان کے ساتھ کیے گئے مظالم کا اس کے خصی کلب کے ممبران اس شہر کے بڑے عزت دار اور امیر کبیر لوگ ہیں جنہوں نے یاور عطائی کے خاندان کو ''ارزل'' بنایا۔

''سیاستدان، تاجر، صنعتکار، بیورکریٹس، اخبار نویس ، عالم، پروفیسر، جج، ریٹائر فوجی، ادیب ، شاعر زمیندار ، جاگیردار ، سمگلر، وکیل ..... یہ سب آپس میں مدغم ہو کر وہ دنیا بناتی ہیں جو یاور عطائی کے ڈرائنگ روم کی دنیا ہے۔''[۱۷]

ان تمام لوگوں کا مسئلہ ہے کہ کسی طرح جوان رہیں کیونکہ عورت ان کا مسئلہ ہے اور یاور عطائی ان کا آخری سہارا اس لیے وہ اس کے خفیہ ڈرائنگ روم میں آتے ہیں۔ وہ سب کے سب یاور عطائی کے محتاج ہیں اور اس نے انہیں اپنا غلام بنایا ہوا ہے''یاور عطائی ان کے درمیان شان سے چل رہا ہوتا ہے اور یہ لوگ جو عوام کی زندگیوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ جو سچ جھوٹ میں تمیز کرتے ہیں۔ جو تلخ حقیقتوں کو قلم کے زور سے عام بندے تک پہنچاتے ہیں لیکن یہ معاشرے کے سرکردہ بے چارے لوگ ایک شخص کے آگے بے بس ہیں۔ ان معزز لوگوں کو اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے اور زندگی کو محض عورت تک رسائی سمجھنے والوں کو عطائی کی بیٹھک میں بھکاری بن کر آنا پڑتا ہے وہ عطائی کے حمام میں ننگے ہیں اور عطائی اپنی فتح کا جشن مناتا ہے۔ امبر جان اور عطائی کی گفتگو ملاحظہ ہو۔

''تمہاری باتیں ہنساتی ہیں عطائی۔ میری روح جوان ہے کیونکہ تم میرے جسم کو جوان رکھتے ہو۔ پھٹے ہوئے باسی دودھ جیسی رنگت کے اس کے چہرے میں سے جھانکتی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں گزری ہوئی شہوانی فتح مندیوں کی یاد سے دھندلی ہو رہی تھیں ایسی فتح مندی تو عطائی کی آنکھوں میں بھی تھی اور ذرا سے کھینچے اس کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ کی لکیر بھی تھی مگر وہ فتح مندی کسی ایسے شخص کی تھی جو کسی خونخوار کتے کو پالتو کر لیتا ہے اور اسے اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور دیکھ کر بس بے نیاز ہو جاتا ہے۔''[۱۸]

پیسے کی بھوک اور انسانی گوشت کی بھوک انسان کی جبلت میں ہیں اور کرپشن کے دور رخ بھی ہیں جو ہماری قوم میں سرایت کر چکے ہیں یاور عطائی اپنے ساتھ کی گئی نا انصافیوں کا بدلہ جنسی طور پر مرجھائے ہوے پاگل لوگوں میں نئی زندگی ڈال کر لیتا ہے:

''کمرے میں پھر چپ اتری تو عطائی نے سوچا کہ اس کا ذہن بہک رہا ہے اسے اپنے قالبوں کو قابو کرنا ہو گا جو ظاہر ہے وہ بھی اور جو مخفی ہے وہ بھی۔ اسے اپنے فیصلے پر اٹل رہنا ہو گا جو برس ہا برس پہلے اس نے کہا تھا کہ وہ زور آوروں سے ارزل جاتیوں کا کچھ تو حساب ضرور دے گا۔ وہ ٹانگوں کے بیچ سے مار کھاتے بادشاہوں کو پھر سے توانا کر دینے کا چھل دے کر انہیں شکار کرے گا مگر اس کے راز کی سرزمین اس کیساتھ ہی دفن ہو جائے گی۔''[۱۹]

اس پورے واقعے کے پیچھے ایک تاریخی حوالہ ہے کہ انسان کی دوسرے انسان پر حکومت یہ اس کی جبلت میں شامل ہے ارزل نسلیں کیا ہیں؟ انہیں بنانیو الا معزز انسان سب سے بڑا ارزل ہے جو معزز ہیں لیکن وہ سب سے زیادہ رزیل ہیں وہ اپنے نفس کے غلام ہیں اور ایک ارزل نے انہیں غلام بنایا ہوا ہے۔ عطائی استحصالی معاشرہ کی پیداوار ہے اسی لیے وہ انتقامی حد تک چلا جاتا ہے۔

گنجینۂ نشاط ایک ایسا تاریخی تصور ہے کہ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے بادشاہ فرمارواں کیا تھے ان کی ترجیحات کیا تھیں یعنی جنس اور اقتدار کا دوام ہی ان کا سب سے بڑا مقصد تھا وہ چاہتے تھے کہ کبھی بوڑھے نہ ہوں اور ان کا اقتدار ہمیشہ قائم رہے اور آج کا بڑا معزز انسان بھی یہی چاہتا ہے یعنی ہماری ترجیحات صرف اور صرف ہماری جنسی خواہشات ہیں ہم جنسی خواہشات کے غلام ہیں۔

ہم رزیل ہیں لیکن ہم سے جو بڑے ہیں وہ ارزل ہیں ایک حالہ ہے کمینگی کا، بد فطری کا، ذلت کا اور سب اس حالے

(Circle) میں قید ہیں۔ انسان کی یہ سوچ موجودہ تباہی اور انتشار کو ظاہر کرتی ہے ہمارے ہاں جو اعلیٰ طبقے کے لوگ ہیں وہ اپنے احساس کمتری میں گم ہیں۔ رضی عابدی کا اس بارے میں کہنا ہے:

> "The upper class shrinks into one shell avoiding any contact with the out side world. It stagnates and stinking. Their world becomes a pool of corruption and they seek the satisfaction of their primitive instincts amongst themselves." [۲۰]

**شناخت:** اس ناول میں ''شناخت'' ایک معتبر تاریخی تصور ہے۔یعنی زہرا کا اپنے ماضی کے بارے میں جاننا زہرا اپنے بارے میں جاننا چاہتی ہے کہ وہ کیا ہے اپنی شناخت کے لیے ہی وہ اپنے باپ سے پوچھتی ہے جب اس کا باپ اس کو تسلی بخش جواب نہیں دیتا۔ تو پھر اس کی یہ جستجو اور زیادہ زور پکڑتی ہے اور وہ کبیر کے ساتھ مانگر جو جاتی ہے لیکن اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا اور اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں۔

شناخت حاصل کرنا بھی ایک غلامی ہے ہر انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کیا ہے ہم لوگ بحیثیت قوم اپنی شناخت کے لئے سرگرداں ہیں۔ شناخت یہ نہیں ہوتی کہ ہم کون ہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ ہم کیا ہیں؟اسی سوال کو اس ناول میں زہرا کی شناخت اور اس کی زندگی کے پس منظر میں ڈھالا گیا ہے۔ ہم بحیثیت قوم اس گومگو میں ہیں کہ ہم کیا ہیں اس لیے ہمارا کوئی خاص نقطہ نگاہ نہیں۔ بقول سید سفیر حیدر:

> ''زہرہ کی بحثیں، زندہ دلی ، قہقے، توانائی ، خاندان سے محاذ آرائی اور کبیر، ناصر اور ہاف مین کے درمیان اپنی ذات کی سرحد بندی کا خیال ، خود کو ثابت کرنے کی شدید کوششوں کا ایک سلسلہ ہے وہ ہر بار نیا قدم اٹھاتی ہے اور سوچتی ہے کہ ''میں ہوں'' مگر ساری فضا اس کے وجود کو نفی کی چادر میں لپیٹ دیتی ہے اس کا دم گھٹتا ہے نابود ہونے سے پہلے وہ بود کے مرحلے سے گزرنا چاہتی ہے لیکن ہمیشہ اپنے وجود کے اثبات سے محروم رہتی ہے۔''[۲۱]

زہرا ملکہ سبا ضرور ہے مگر خلا میں معلق اجڑے شہر کی طرح جو اپنی جڑوں کی بازیافت اپنی یاداشت میں نہیں رکھ سکتی وہ اپنے باپ سے اس کے معمہ کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہے یہی اس کا جنون ہے لیکن اس کو کچھ حاصل نہیں ہوتا ہمارا ذاتی المیہ کہیں نہ کہیں معاشرے سے جڑا ہوتا ہے۔ ذاتی المیے ذاتی نہیں ہوتے بلکہ ان کی جڑیں پورے ماضی میں ہوتی ہیں ماضی کو یاد کرنا اور جاننا تو ٹھیک ہے مگر اس کو دہرانے کی خواہش آدمی کو برباد کر سکتی ہے۔ شاید انسان کے مقدر میں واپسی ممکن نہیں قدرت نے حرکت کا حکم دیا ہے ہم بچپن کو یاد تو کر سکتے ہیں لیکن دہرانا چاہیں تو یہ ناممکن ہے زہرا بھی ماضی کو دہرانا چاہتی ہے مگر اس کی یہ کوشش لاحاصل ہے۔ زہرا کا اپنے باپ سے سوال کہ ہم ہیں تو کیوں ہیں؟ اس کا عطائی کے پاس زہرا کو مطمئن کر دینے والا جواب نہیں کیونکہ وہ پیچھے سے کچھ بھی نہیں۔

**طبقاتی کشمکش:** ایک اور اہم تاریخی حوالہ جو اس ناول میں موجود ہے انسان کا انسان پر غلبہ اور طبقاتی کشمکش ہے۔ ایک طبقہ جو

بظاہر شان و شوکت رکھتا ہے، وہ اپنے اقتدار کی وجہ سے اپنے نیچے کے لوگوں کو کم تر اور حقیر سمجھتا ہے۔ اونچے طبقے نے بنایا یہ انسانوں نے ہی ارزل نسلیں پیدا کیں اور اپنے آپ کو بلند مقام پر لے گئے۔ یعنی انسان کا انسان پر غلبہ اس کا بنیادی موضوع ہے۔ ہر انسان دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد آج بھی ہم عہدے شان و شوکت اور اقتدار کے غلام ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس اجتماعی سوچ کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔

آج کا انسان بہت بے بس ہے انتشار کا شکار ہے۔ کیونکہ نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد بھی استعماری قوتوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے اور اپنی شناخت الگ نہیں بنا سکتا اور اپنی شناخت حاصل کرنے کی کوشش میں وہ پھڑا پھڑاتا ہے لیکن کچھ بھی نہیں کر سکتا یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتا ہے۔ زہرا کو کبیر کہتا ہے۔ ''پتا نہیں میں کیا ہوں؟ کبھی شاید جب کبھی میں نے اپنا اصل کام مکمل کر لیا تو پھر میں بتا سکوں گا کہ میں کیا ہوں۔'' اگر 'غلام باغ' کے استعارہ کو دیکھا جائے تو اس میں کسی ایک فرد کی ذات نہیں بلکہ متنوع جہتیں سامنے آتی ہیں پوری کائنات میں یہ غلام باغ پھیلا ہوا ہے۔ اس 'غلام باغ' کے پرندوں کا اضطراب دیدنی ہے نادیدہ دیواروں سے سر ٹکراتے ہیں خالی آسمان کو گھورتے ہیں۔ کسی مدفون خزانے کی تلاش میں اپنے اپنے وجود کی بنجر زمین کو کریدتے ہیں۔ کوئی اپنی ارزل نسلوں کے جنسیاتی مسائل کے غلام باغ میں ہے کوئی نو آبادیاتی نظام کی باقیات کی غذا بن رہا ہے کچھ لوگ لذت وجود کے غلام باغ میں کھوکھلے جسموں کی گرتی دیواروں کو سہارا دینے کی سعیٔ رائیگاں میں مبتلا نظر آتے ہیں ہر کردار اپنے اپنے مقدر کے بھاری پتھر کو پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتا ہے لیکن سر شام سے ہی نامراد تھکن ان کی منتظر ہوتی ہے۔ غلام باغ میں کبیر کا اضطراب باطنی کرب کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ بقول سفیر حیدر:

> ''اس کی اڑان میں تو نہیں لیکن اڑان کے ارادے میں بڑا تحرک ہے یہ کردار آج کے نوجوان کی بنجر سائیکلی کا منظر نامہ ہے غلام باغ کے باقی کردار کسی ظاہری حادثے، رشتے، خواہش، کمزوری یا وراثت کی وجہ سے متاثر ہے لیکن کبیر وہ کردار ہے جو اپنے اندر سے برباد ہے جیسا کہ سارت نے ژینے کے متعلق کہا تھا کہ اس نے اپنا مقدر خود ناکامی اور بربادی سے عبارت کیا تھا۔ کبیر روشن کینوس پر تاریکی کی تصویریں بناتا ہے بے ثمر مسافت کی اکتاہٹ نے اسے بیمار کر دیا ہے۔ وہ کتابوں کی دنیا میں لفظوں کی ریت پھانک رہا ہے اور 'اصل کام' کی دوری کے ناقابل علاج احساس محرومی میں مبتلا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک لفظ انسان کو آزاد کرتا ہے جو شخص اپنا اظہار نہیں کر سکتا ہ دراصل غلام ہے۔''[۲۲]

کبیر لفاظی کے ذریعے آزادی کی خواہش رکھتا ہے۔ لیکن الفاظ جو 'غلام باغ' بنے بیٹھے ہیں۔ اس کی ہذیان نویسی، زبان کے غلام باغ کی فصیل پر شگاف ڈالنے کی کوشش ہے وہ پیسے لے کر سطحی لفظ بیچتا ہے اس طرح اس کی سائیکی کی مثال ایک ایسی عورت کی مانند ہے جو جسم بیچنا غلاظت سمجھے لیکن اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہ ہو اور نہ ہی راستہ بدلنے کا حوصلہ ہو ہر وقت ایک مجہول ارادے کی زد میں رہے۔

اس کی ہمیشہ خواہش رہی کہ کبھی تو اس کا اصل کام سامنے آئے گا لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ دنیا غلام باغ ہے یہاں جرم

سے پہلے سزا ملتی ہے۔ کبیر جلائے جانے کی کوشش کے بعد جب ٹھیک ہوتا ہے اور دوبارہ لکھنا چاہتا ہے اپنا اصل کام شروع کرنا چاہتا ہے تو ہاتھ سے لکھ نہیں سکتا تو وہ کہتا ہے:

''میرا لکھنے والا بازو کچھ اس طرح کا بچا ہے بلکہ یوں کہو کہ باقی بچایا گیا ہے کہ یہ دنیا کے سب کام کر سکتا ہے سوائے لکھنے کے۔'' ۲۳

نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا یہ جملہ دیکھیں:

''سنو گورے چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈنے والوں کی سزا موت ہوتی ہے خواہ وہ زمین کھو دینے والے ہوں یا علم کھو دینے والے۔'' ۲۴

کبیر کا رویہ بنجر علمیت کا روگ ہے کبیر کا باغیانہ کردار آج کے نوجوان کا کردار ہے جو نئی سوچ رکھتا ہے جو کچھ معاشرے میں دیکھ رہا ہے۔ اپنی غلامی کو ہماری سوچ کو بدلنا چاہتا ہے۔ ہمیں آزادی دلانا چاہتا ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر پاتا جو وہ اصل کام کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر پاتا روزانہ ایک نظریہ دیتا ہے اور پھر اسے خود ہی اپنے نظریے کو تبدیل کرنا پڑتا ہے اس کے اندر کچھ کرنے کی خواہش اور پھر نہ کر سکنے کی ٹوٹ پھوٹ پورے ناول میں ہمیں نظر آتی ہے۔

کبیر نے 'غلام باغ' کے بنجر زمین کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا ہے گھونسلے میں یورپین کتابوں نے اسے سوچنے پر مجبور کیا کہ ہم کتنے اندر سے کھوکھلے ہیں اور انگریزوں نے ہمیں کس طرح غلام بنایا ہوا ہے۔ کبیر چونکہ ارزل نسل سے تعلق رکھتا ہے اور آج کے ہمارے باغی نوجوان کا کردار ہے ایک ادیب ہے جو اپنی شناخت کروانا چاہتا ہے لکھائی کے ذریعے وہ اصل کام نہیں کر پاتا:

''ناول کا آغاز ہی کبیر کے جملے سے شروع ہوتا ہے کہ اس لمحے میں دیکھو''۔ ۲۵

اور آخری جملہ کہ:

''فکشن کے خالق کو خدا بننے کا حق کس نے دیا ہے''۔ ۲۶

اگر نوآبادیاتی حوالے سے دیکھیں تو کبیر ہی غلام باغ ہے انگریزوں کے بارے میں اس کا نظریہ ہاف مین کے ساتھ اس کا تعلق زہرہ اور ڈاکٹر ناصر کے ساتھ اس کی گفتگو اور تعلق یہ ایک ایسی تہذیب میں رہ رہا ہے جو کہ نوآبادیاتی دور کے بعد کی تہذیب ہے وہ موجودہ زمانہ میں زندگی گزارا ہے۔

اس کردار کے ذریعے ہمیں پتہ چلتا ہے نوآبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد بھی ہم آج کس مقام پر کھڑے ہیں اور کس طرف جا رہے ہیں اور اس جیسے باغی نوجوان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اگر غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اسکا انجام کیا ہوتا ہے۔ ناول میں اختتام میں کبیر کا مر جانا ٹھیک تھا آج کے زمانے میں ایسے نوجوان کا یہی حال ہوتا ہے اور پھر کبیر کو پتہ چل گیا کہ ارزل نسلوں کی اساطیر کیسے بنتی ہیں ہماری زندگی آگہی سے شروع ہوتی ہے اور آگہی پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اس ناول میں کبیر مہدی کی موت تلاش

صداقت اور اظہارِ حقیقت کے علمبردار کی موت ہے۔ ہم چونکہ غلام ہیں استعماری طاقتوں کے اور غلاموں کا ہمیشہ ہی المیہ رہا ہے کہ انہیں صحیح سمت نہیں ملتی۔ اگر ہمارے ذہن میں کوئی سچا خیال آ جائے اور ہمارے وجود کا حصہ بھی بن جائے تو اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ اگر ہم حقیقت کا ادراک کر لیں تو ہم اس تک نہیں پہنچ سکتے اس طرح یہ خود آگہی ہمارے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

غلام باغ ایسا غلام باغ ہے جو حقیقت تک پہنچنے ہی نہیں دیتا مغرب کے پاس تمام ذرائع ہیں کہ حقیقت تک کیسے پہنچا جائے لیکن وہ ہمیں کیوں بتائیں، وہ تو قاتل ہیں ہماری سوچ کے اور اگر کبیر جیسا (مہم جو) حقیقت کا ادراک کر بھی لے تو اس کا اظہار معاشرتی سطح پر ناممکن ہے اور اسے ختم کر دیا جاتا ہے، اس بارے میں سید سفیر حیدر لکھتے ہیں:

''یہاں اپنے خواب کی اُنگلی پکڑ کر چلنے والوں کو زندہ جلایا یا دفنایا جاتا ہے۔''[۲۷]

اس کے علاوہ کبیر کے کردار کے ذریعے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارا ادیب محتاج ہے ہمارا ادیب شروع سے محتاج ہے اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے شروع ہی سے ہمارا ادیب بکتا رہا ہمارا شاعر قصیدے لکھنے پر مجبور ہے اسے شاہوں کے قصیدے لکھنے پڑے اور ان کی ہجو لکھنی پڑی اپنا پیٹ پالنے کیلئے اور آج کا ادیب بھی اسی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے کہ پیٹ پالنے کے لئے اپنی مرضی کے خلاف لکھنا پڑتا ہے اور ہمیشہ جو وہ کہنا چاہتا ہے نہیں کہہ پاتا چنانچہ یہ ادب کی احتیاج رہی کہ ہمارا فن بکتا رہا ہے۔

عام انسان میں اور باشعور میں یہی فرق ہوتا ہے کہ باشعور انسان جب کچھ کرنا چاہتا ہے اور وہ نہ کر سکے تو وہ اپنی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے جبکہ عام انسان پر اثر نہیں ہوتا۔ اور کبیر نے بھی یہی کیا کیونکہ وہ عام انسان نہیں تھا۔اس کے علاوہ جب تک انسان اپنی ضرورتوں سے ماورا نہیں ہو گا وہ کچھ نہیں کر سکتا کبیر اپنا اصل کام جو وہ کرنا چاہتا تھا اس لیے نہ کر سکا کیونکہ اس کی ضرورتیں اس کے اصل کام کے آگے آڑے آئیں۔

ہاف مین ایک انگریز آرکیا لوجسٹ ہے جو کہ غلام باغ کا معمہ حل کرنا چاہتا ہے اس ناول میں اسکا کردار بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔انگریز اگرچہ ہمارے ہندوستان سے جا چکے ہیں لیکن وہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہیں کبھی وہ ہاف مین کو بھیج دیتے ہیں اور کبھی کسی اور کو انہیں ہمیں غلام بنانے کے لیے کسی بارود اور بم کی ضرورت نہیں بلکہ وہ کسی نہ کسی طرح سے ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں اور آج بھی ہم ان کے شکنجے میں ہیں ۔

کبیر کا ڈاکٹر ناصر کے ساتھ مکالمہ گوروں کے خلاف نفرت ناول کے شروع ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔

''کوئی مانے یا نہ مانے لیکن چٹی چمڑی ، گورے بدن کا جادو بڑا ظالم ہے یہی دراصل کالا جادو ہے سفید بندے کو دیکھ کر دل کے اندر کہیں گھونسا سا پڑتا ہے۔''[۲۸]

ہاف مین کی جب ان سے بات چیت ہوتی ہے اور ان سے نشست رہنے لگی تو ہاف مین سے اساطیر اور نشہ آور پودوں کے بارے میں ہی گفتگو ہوئی تو ہاف مین بہت مرعوب ہوا لیکن کبیر کو معلوم تھا کہ وہ مرعوب نہیں محظوظ ہوا ہے۔

''جیسے کمپنی بہادر کا کوئی گورا صاحب اپنے خانسامے کو انگریزی کے فقرے پہلی بار درست بولتے دیکھ کر amused ہوتا ہوگا۔'' لیکن ہاف مین تو جرمن ہے جبکہ کمپنی بہادر کا گورا صاحب جزائر برطانیہ ۔۔۔'' ناصر نے کہنا چاہا تھا لیکن کبیر نے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔''یہ سب گورے ایک ہیں۔''[۲۹]

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ یورپین چاہے وہ کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہوں استعماری قوت ہیں اور ان سے نفرت کبیر جیسے نوجوان کی یقینی ہے۔

ہاف مین کی موت بھی ایک معمہ ہے او ایک معتبر تاریخی حوالہ بھی ایک تو اس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ ماضی کو کریدنے سے کچھ حاصل نہیں زہرا نے کریدنا چاہا اسے کچھ نہیں ملا اور ہاف مین جنم کھنڈر پر تحقیق کرنا چاتا تھا اس کو کریدنا چاہتا تھا وہ خود اس میں دفن ہو گیا اس سے یہ بات واضح جاتی ہے کہ پرانی چیزیں کریدنے سے انسان خود ان میں دفن ہو جاتا ہے اور انجام لا حاصل ہے اس ناول میں یہ ہر شخص کوشش کر رہا ہے لیکن کوشش لا حاصل ہے۔ ہاف مین گرٹریوڈ کہتی تھی:

''ڈرالنگ تم سے کبھی کبھی مجھے مقامیوں جیسی بو آتی ہے۔''[۳۰]

اس کا انجام بھی مقامیوں جیسا ہوتا ہے ہاف مین (آدھا آدمی) کھنڈر کھوجتے کھوجتے خود کھنڈر بن گیا اور اس کا اس طرح کھنڈر ہونا اسے پورا آدمی بنا گیا۔ اس طرح جنم کھنڈر کی پرتیں بھی کھل جاتی ہیں۔ کبیر کہتا ہے:

''مدفون دنیائیں ڈھونڈنے والا بھدی سطحیں دور بنانے والا اگر ایک روز اپنے اسی جنون کیساتھ خود بھی ہمیشہ کیلئے دفن ہو جائے۔ ۔۔تو کیا یہ ایک شاندار انجام نہیں ہے۔۔۔آخر دفن ہونا سب کا مقدر ہے۔''[۳۱]

ہاف مین کو اصولی طور پر بھی مر جانا چاہیے کیونکہ ہماری زندگی آگہی سے شروع ہوتی ہے اور آگہی پر ختم ہوتی اور ہاف مین کے ساتھ وہی ہوا۔

**ننگا افلاطون :** ننگا افلاطون (چٹا سائیں) کا کردار مذہبی اوہام پرستی پر (امتلائی کیفیت) پر شدید طنز ہے وہ اپنی حیوانیت میں جس کو گالی دے اس کو رنگ لگ جاتا ہے یہ تو ہم پرستی کی بدترین مثال ہے جل پتھری کی کھوہ میں قیام پذیر چٹا سائیں ننگے رہنے کے باوجود تعلیم یافتہ اور جاہل دونوں کے دلوں پر راج کرتے ہیں۔ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کا یہ پہلو خوب ہے اس کی پیدائش کی روایت بھی اہم معتبر تاریخی حوالہ بنتا ہے:

''چٹا سائیں اس صدی کے شروع میں نورداد کی دادی کے گھر پیدا ہوا نور داد کی دادی کی نانی کی پرانی غدر میں بچھڑی ہوئی ایک گوری میم تھی جیسے باغیوں نے اپنی طرف سے خراب کر کے مار دیا تھا لیکن نورداد کا اس زمانے کا کوئی مرد اسے بچالایا اور اسے کہیں چھپا کر اس سے شادی کر لی اس سے اولاد لیتا رہا اور اس کی نسل آگے بڑھتی رہی اور اس طرح سفید خون اور نیلی آنکھیں نو ر داد کی نسل کے خون میں مل گئیں۔ لیکن اچانک جب نورداد کی دادی نے چٹا بچہ جنا تو وہ ڈر گئی اور اس کا خاوند ڈر گیا کیونکہ وہ دونوں تو سفید نہیں تھے وہ دونوں گندمی تھے۔ وہ ڈر گئے کہ کون مانے گا

کہ یہ ان کا جائز بچہ ہے۔''[۳۲]

چونکہ وہ زمانہ انگریز کا تھا نورداد کا دادا بڑے خاندان کا مالک تھا اور انگریز کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات تھے انگریزوں نے اسے کافی زمین دی تھی کیونکہ وہ ان کا وفادار تھا۔ اس نے 1857ء میں باغیوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔ بچہ کی پیدائش پر نوراد کے دادا نے اپنی بیوی اور بچے دونوں کو مارنا چاہا لیکن پھر اسے یقین ہو گیا کہ گوری میم ہی کا خون ہے وہ اسے غار میں چھوڑ گیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ بچہ غار میں زندہ ہے سب لوگوں نے جب دیکھا تو حیران رہ گئے اور مشہور ہو گیا کہ:

''یہ بچہ کوئی پیر فقیر یا ولی ہو اور سنمبال کیلئے رحمت بن کر آیا ہو اب وہ ہمیشہ اس غار میں رہے گا اس کی خدمت کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی پاس حاضر رہے گا اور گاؤں کی عورتوں کے پستانوں کا دودھ اس کیلئے ہمیشہ حاضر رہے گا۔'' [۳۳]

ہر خطے میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کیلئے وہ ہر طرح کے حربے آزماتا ہے اور دولت کیلئے وہ اپنی عورتوں کو انہی حاکموں کے پاس بھیجتا ہے اپنے لیے عہدہ اور مرتبہ حاصل کے لیے یہ طبقہ اخلاقی طور پر انتہائی نیچے چلا جاتا ہے۔ اس واقعہ میں بھی اسی طرف اشارہ ملتا ہے۔یعنی نو آبادیاتی دور میں جو آقا ہمارے اوپر رہے انہوں نے ایسی سرنگیں بنائیں کہ ہمارے معاشرے نے انہیں بہت مرتبہ دیا یہاں تک اپنی عورتیں ان کے حوالے کیں اس طرح جن لوگوں پر کلونیل آقاؤں نے توجہ دی وہ اشراف بن گئے۔

یہی اشراف ہیں جنہوں نے اپنے سے کم تر لوگوں کو ارزل بنا دیا اس میں یہی تصور حیات موجود ہے۔ارزل نسلیں تبھی وجود میں آتی ہیں جب معاشرے کے جھوٹے مکار بڑے طبقے کے لوگ خود کو معزز اور اشراف سمجھتے ہیں جبکہ اپنے سے نیچے والے لوگوں کو کمی کمین اور کم تر تصور کرتے ہیں اصل میں سب سے بڑے رزیل تو یہ خود ہیں اور یاور عطائی اپنے ارزل ہونے کا ان سے جو بدلہ لیتا ہے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہیں کہ سب سے بڑے ارزل یہ معزز لوگ ہی ہیں۔

سکہ ایک اہم تاریخی حوالہ ہے۔ مدد علی جو نواب ثریا جاہ نادر جنگ کے کہنے پر جنم کھنڈر میں خزانہ ڈھونڈتا ہے جب اسے سکہ ملتا ہے تو وہ منہ بند کر لیتا ہے مدد علی کو معلوم ہے کہ یہ بر طانوی سکہ ہے اور اہمیت رکھتا ہے تبھی اس نے اپنا منہ بند کر لیا۔ اگر اسے اس کی اہمیت کا اندازہ نہ ہوتو تو وہ کبھی منہ بند نہ کرتا ہماری زمین سے آقاؤں کا سکہ برآمد ہو رہا ہے ہمارے آقا انگریز ہمیں اپنا غلام بنا کر چلے گئے لیکن اپنی نشانیوں کے طور پر آج بھی یہاں موجود ہیں۔

گنجینۂ نشاط (مجربات برائے درازی عمر بادشاہ و شباب دائمی الیشاں ) کی تلاش میں جب زہرا اور کبیر عطائی کے خاص کمرے میں جاتے ہیں وہاں پر مختلف مرتبان ہیں جن پر لیبل لگے ہوئے ہیں اور مختلف معزز ، اشرافیہ لوگوں کے نام درج ہیں یہ عجیب وغریب دنیا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے عطائی نے ان معزز اشرافیہ کی کمینگی کو قید کیا ہوا ہے زہرا اور کبیر گفتگو کرتے ہیں تو زہرا کہتی ہے:

''عظیم مرد انسان کی بدبختی کیا اسے اپنی ہستی کی سختیاں جون کی مجبوریاں اس شکست کی قبولیت سے محروم کر دیتی ہیں

مگر وہ بچ نہیں پاتا کوئی فرار اس کے لئے بھی نہیں ہے مگر وہ اس لاتعلق ہستی اور نیستی کے اس تعلق کا سامنا کرنے پر ایک عذاب میں گرفتار ہوجاتا ہے اور اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں وہ اپنی بدنصیبی کو پورے جہاں کی بدنصیبی بنا دیتا ہے وہ اپنے عذاب کو کبھی ایک شکنجے میں جکڑتا ہے کبھی دو کی تفریق میں چیرتا پھاڑتا ہے اور پھر اسے پورے غلام باغ پر مسلط کر دیتا ہے۔ ہاں میرا باپ اسی ظلم کا تاجر تھا شاید اس لیے کہ اس پر بھی ظلم ہوا تھا مرد یا عورت کے طور پر نہیں۔ انسان کے طور پر ظلم عظیم انسان پر ہوتا ہے مرد اور عورت پر نہیں۔''[۳۴]

عطائی کا یہ کمرہ اور پھر مختلف مرتبان جس میں معزز اور اشرافیہ کی کمینگی قید ہے یہ ہمارے اشرافیہ کی جنسی زندگی کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اخلاقی طور پر کسی قدر گرے ہوئے تھے اور صحیح معنوں میں یہ کس طرح رزیل ہیں۔

امبر جان اور نجم الثاقب کے کردار عیاش لوگوں کے کردار ہیں۔ امبر جان عیاش امراء کا نمائندہ ہے جنہوں نے ہمیشہ اپنے سے چھوٹے لوگوں کو دبانے کی کوشش کی جنہوں نے ہمیشہ دانشوروں، سچ بولنے والوں کے ساتھ ظلم کیا انہیں استحصال کا نشانہ بنایا۔

حسین سے لے کر حلاج تک اور پھر مجد الف ثانی یہ سب تاریخی تسلسل ہے کہ ہمارا پڑا لکھا اہل علم طبقہ ہمیشہ امراء کے ہاتھوں سولی پر چڑھا ہے حق بات کہنے والوں کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ امبر جان نے کبیر کے ساتھ بھی یہی کیا پہلے جلانے کی کوشش کی وہ بچ گیا۔ تو پھر اسے پہاڑی پر سے گرا دیا اور اس بار یہ کام اس نے خود کیا حالانکہ وہ کسی اور سے بھی کروا سکتا تھا لیکن پہلی بار کبیر کا بچ جانا اب اسے کسی اور کے ذریعے نہیں بلکہ خود اسے مارنا پڑا اور کبیر کا مرنا بالکل ٹھیک تھا کیونکہ ہمارے یہاں کبیر جیسے لوگوں کا زندہ رہنا کسی تباہی سے کم نہیں اس لیے اسے اصولی طور پر مر جانا چاہیے تھا۔ اور ایسا ہی ہوا۔

چنانچہ امبر جان ایک نفرت آمیز عیاش امیر ہے جو اپنے خلاف کوئی بات برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ زہرا کو حاصل کرنے کیلئے کبیر کو مارنا پڑا اور پھر کبیر اس کی تمام کمینگی جان گیا تھا یہ کردار ہمارے معاشرے کے انتہائی مکرو امیروں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نجم الثاقب ایک ایڈیٹر ہے یہ بھی عیاش مرد ہے اور کبیر کا دشمن بھی کیونکر کبیر اس کی کمزوریوں سے آگاہ ہے اور اس لیے یہ کبیر سے خوفزدہ ہے اور اسے ختم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ان کے ظاہری شریفانہ لباس کو اتار سکتا ہے۔ یہ کردار بھی آج کے بظاہر شریف لیکن انتہائی لالچی اور اخلاقی طور پر گرے ہوئے انسان کی نمائندگی کرتا ہے۔

ناول میں ایک انگریزی کتاب کا ذکر جس میں ٹھگوں کی متھ کا ذکر ہے اور ایک اہم تاریخی اور تہذیبی حوالہ ہے اس میں ایک طرف ٹھگوں کی متھ کا ذکر اور دوسری طرف مسلمانوں کے عقیدے پر گہرا طنز ملتا ہے کہ مسلمان ایک طرف تو ایک اللہ پر یقین رکھتے ہیں اور دوسری طرف بھوانی کے پجاری ہیں انگریز پادری بہت زیادہ حیران ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ترقی یافتہ اقوام ہیں جن کے بنیادی تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

''ایک مسلمان اور باقاعدہ پکا مسلمان شرع و شریعت پر پکا ایمان رکھنے والا پابند صوم وصلوٰۃ مسلمان بھوانی پر والہانہ مذہبی عقیدت اور روحانی جوش وخروش سے کیسے ایمان لا سکتا ہے۔''[۳۵]

ٹھگوں کے بارے میں سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ہندو اور مسلم مل کر ایک ساتھ چلتے ہیں اور ایک ہی قسم کی توہمات میں مبتلا ہیں ہندوؤں کے ہاں تو دیوی پوجا کی سمجھ آتی ہے لیکن مسلمانوں کا اس عمل کو اختیار کرنا انتہائی نا قابل فہم عمل ہے۔ پادری ہٹلر کا حوالہ دیتا ہے:

''یہ وہ مقام ہے جہاں امیر علی کے باقاعدہ ٹھگ بننے کی رسم ادا کی جاتی ہے وہ پہلے بھوانی سے شگون لیتا ہے اور بعد میں قرآن شریف پر قسم کھاتا ہے اور اس کا والد اسے مخاطب کر کے کہتا ہے بیٹا آج سے تم اس گروہ میں شامل ہوئے جو دنیا کا قدیم ترین مذہبی فرقہ ہے تم نے وفادار، بہادر اور راز دار رہنے کی قسم کھائی ہے آج سے تم بنی نوعِ انسان کے دشمن اور ہر شخص کو بلا پس و پیش ہلاک کر سکتے ہو۔''[۳۶]

یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ربط نہیں ہے اس میں کچھ اشارے ہیں صرف جگہوں کے اصل نام بھی نہیں وہ پادری ہندوستان میں ٹھگوں پر تحقیق کرنا چاہتا تھا مگر اپنا حافظہ کھو بیٹھا۔ اس میں اس نے چند اشخاص اور جگہ کے بارے میں اشارے کیے ہیں:

''وہ جس کے ماتھے پر کالا تل ہے جس کا آدھا دانت ٹوٹا ہوا ہے وہ جو موتیوں کی مالا پہنتا ہے وہاں جہاں خون جلد سوکھتا نہیں، وہاں جہاں شیطانی زینوں سے نیچے جاتے ہیں۔''[۳۷]

کبیر سوچتا ہے کہ یہ شیطانی زینے شاید یہی ہیں جو غلام باغ کے جنم کھنڈر میں ہیں۔ بہر حال انگریز پادری کی کتاب کا ذکر اور پھر ٹھگوں کے بارے میں معلومات اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں جو حوالے ہیں وہ تاریخی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کے عقائد کو شک کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور ان پر طنز کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ عقلی اور منطقی تضادات ملتے ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز مسلمانوں کے مذہب تک کو بھی پیچیدہ صورت حال میں پیش کرتے ہیں اور انہیں مذہبی طور پر طنز کا نشانہ بناتے ہیں ان گوروں نے ہمیں ہر طرح سے غلام بنایا ہوا ہے اور ہماری اقدار کو مسخ رہے ہیں۔

**گھونسلا**: اس کے علاوہ 'گھونسلا' بھی ایک اہم تاریخی حوالہ ہے جو کبیر کے رہنے کی جگہ ہے اس میں موجود یورپی کتابیں علامتی حیثیت رکھتی ہیں یہ مغربی اکیڈمی ہے یعنی مغربی دنیا کا علم ہے جو اس گھونسلے میں موجود ہے اسی لیے کبیر جب رات کے وقت نیلا رجسٹر پر کام کر رہا ہوتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ جیسے تمام انگریز مصنف گھونسلے میں موجود کتابوں سے نکل کر اس پر حملہ آور ہونے والے ہیں یہ ایک اور اہم زاویہ ہے جس میں ہمارا جو مغرب ادب کے ساتھ تعلق ہے اس کے بارے میں وضاحت ملتی ہے اس کے جعلی پن سے ہی تو کبیر نے React کیا ہے۔ اس میں آگے چل کر کہیں کی کیفیت جو ہے کہ: ''دوبارہ لکھو'' [۳۸]

یہ دوبارہ لکھو کیا ہے یہ ایک بہت بڑی تاریخی علامت ہے کہ ہمیں اپنی جگہ اس ساری صورتِ حال کو دریافت کرنا ہے، خود جاننا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو اس ناول میں انوکھے انداز سے آج کے موجودہ معاشرے کو وہ معاشرہ جس میں ہم بحیثیت قوم سانس

لے رہے ہیں بیان کیا گیا ہے اگر چہ آج ہم نو آبادیاتی دور سے نکل چکے ہیں ہم آزاد ہیں لیکن آج کا نوجوان ، آج کا انسان حقیقتاً غلام ہے انگریز خود تو چلے گئے اس خطہ سے لیکن اپنی تمام روایات چھوڑ گئے۔ہمیں غلام بنا گئے اور ہم آج بھی غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اگر آج کوئی کبیر مہدی جیسا انسان آزادی کی بات کرے تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ اور نہیں بنتی کبیر مہدی جس کے جگر میں عہد جدید اور ماضی کے تمام ادوار سمائے ہوئے تھے اخیر میں اسے مار دیا جاتا ہے اسکا مرنا بالکل ٹھیک تھا کیونکہ اتنے زبردست انتشار اور اضطراب کا بوجھ وہ نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے اس کا قصہ ختم ہو گیا ڈاکٹر ناصر اور زہرا زندہ بچ گئے کیونکہ ناصر کو ابھی اپنے بارے میں بہت کچھ جاننا تھا یہ ناول موجودہ زمانے کی افراتفری بے ترتیبی اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے اس میں ہر کہیں رات ہی رات ہے نہ ختم ہونے والی۔بقول سعادت سعید:

> ''اس ناول کے کرداروں کے سروں پر کوئی بے پایاں عجلت سوار ہے اور ان کے سینوں میں دل شکاریوں کی ظالم آنکھوں کی مانند ہیں ان کے اردگرد تازہ خون کے پیاسے سامراجی کارندے یا افرنگی مردان زاد موجود ہیں ان کے بنائے ہوئے دیو آہن جیسے مضبوط مشینی نظام کی غلامی سے نجات کی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔اس شہر میں گورے کالے کی کشمکش عروج پر پہنچی ہے کالا شر کی علامت ہے اور گورا خیر کی غلام باغ سے متبادر ہوتا ہے کہ نو آبادیوں کے انسان درد دینے والوں سے یعنی گوروں سے اپنے امراض کی دوائیں لینے پر کمر بستہ ہیں۔انہی کے آرکیالوجسٹ ان کے انسانوں کے رہنما ہیں مقامی انسان بارمژگان ہیں اور فرنگی لب خنداں۔''[۳۹]

''غلام باغ'' ایک عالم صغیر ہے اس میں دانشوری بے مصرف زندگی کی عکاس ہے لمحہ موجود میں سب کچھ دیکھا اور دکھایا جا رہا ہے شہر میں سب پیمانے بے صرفہ ہیں کہ یہاں کے عمومی رجحان کے تحت انسانوں کو سیم و زر کے پیمانوں پر تولنا بنیادی اقدار میں شامل ہے اس میں بھی ذوق عمل کا ہر سر چشمہ بے معنی ہذیان بن چکا ہے اس شہر میں یہ ہر وقت ہر لمحہ ایک انجانی دہشت جان کنی کا سبب بنی ہے اس شہر کے انسانوں کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست نہیں ہیں پدری آقائی اور شاہی تمناؤں کی تکمیل کرنے والے اونچے انسان اپنے سماوی مسکنوں میں بے حسی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اسی پر قانع ہیں ۔غلام باغ اور اس پر محیط عالم اکبر بربادی اور ویرانی کے طوفانوں کی پہنچ میں ہے۔اس ناول میں رات ہی رات ہے اپنی تمام تر ہیئت کے ساتھ اس رات کے بارے میں کبیر کا خیال ہے:

> ''یہ رات ہے امنڈتی رات آسمانوں
> اور زمینوں کے بیچوں بیچ پھیلی تیرگی کا مہیب سمندر''[۴۰]

پورے ناول میں ہر طرف اندھیرا گھپ اندھیرا ہے یہ غلام باغ ہے یہاں گفتگو کا ہی نہیں واقعات کا بھی ہذیان ہے یہاں پنجرے پرندوں کے متلاشی میں ہیں اس غلام باغ میں ان گنت دروازے ہیں جو شیطانی زینوں کے فرش پر کھلتے ہیں اور ان سے آگے شگاف ہی شگاف ، کسی ایک ہی غیر محتاط قدم کا بہانہ کافی ہے اور ڈراؤنا گہرا گڑھا ناگزیر تقدیر بن کر گود میں لے لیتا ہے۔

'غلام باغ' میں تمام کردار مثلاً مافوق الفطرت طاقت رکھنے والی زہرا، دولت کی بھوک رکھنے والا ادیب، ڈاکٹر ناصر، خزانے کی تلاش کرنے والا مدد علی، غلام باغ کا معمہ حل کرنے والا ہاف مین جھوٹی شان و شوکت رکھنے والا نواب ثریا جاہ نادر جنگ، پاگل عورت اور عیاش مردوں کی نمائندگی کرنے والا امبر جان تمام مل کر اب بے مقصد اور بے معنی تلاش کی دنیا کو تشکیل دیتے ہیں یہاں صرف ایک ہی طریقہ ہے جس کی تمام کردار پیروی کر رہے ہیں وہ طریقہ صدیوں پرانی جبلتوں کی عکاسی کرتا ہے، زندگی میں ہونے والی حرکت صرف پیچھے کی طرف جارہی ہے اس سے کچھ بھی آگے بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا۔

آج کے نو آبادیاتی انسان کا یہی مسئلہ ہے کہ اس کی زندگی کی حرکت پیچھے کی طرف جارہی ہے۔ یہی مسئلہ اس ناول میں کرداروں کے مکالموں اور واقعات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد آج کا انسان کہاں پر کھڑا ہے؟ اور یہ سب سے بڑا تاریخی المیہ ہے کہ آج کا انسان انتشار اور اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہے اس کی زندگی بے شمار راتوں سے عبارت ہے یہاں نشان زدہ زندگی کو بلڈوز کردیا جاتا ہے اور یہاں سے خدا بھی ہجرت کر چکا ہے کیونکہ وہ آزاد ہے اور غلام باغ میں اس کا کیا کام۔

## حوالہ جات


۱۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر: (فلیپ) غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اشاعت اوّل، ۲۰۰۶ء

۲۔ عبداللہ حسین: (فلیپ) غلام باغ، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء

۳۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر: ''نو آبادیاتی صورتِ حال''، مشمولہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور زبان و ادب، مرتبین: ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر: ناصر عباس نیر، لاہور: اورینٹل کالج، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۴۔۲۶۳

۴۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۲۶۵

۵۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، ص ۲۷۰

۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر: غلام باغ – 'ناول آف دا پسرڈ'، مشمولہ: ماہنامہ قومی زبان، کراچی: شمارہ ۱۱/نومبر ۲۰۰۸ء، ص ۶۲

۷۔ اطہر بیگ، مرزا: انٹرویو، رخسانہ بی بی، بمقام جی سی یونیورسٹی، ۲۳/مارچ ۲۰۰۸ء، وقت ۱۲:۱۰ دوپہر

۸۔ اطہر بیگ، مرزا: غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلشرز، اشاعت اوّل، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶

۹۔ غلام باغ، ص ۱۷

۱۰۔ غلام باغ، ص ۶۰۵

۱۱۔ غلام باغ، ص ۲۰۱

۱۲۔ غلام باغ، ص ۲۰۶

۱۳۔ غلام باغ، ص ۵۵

۱۴۔ غلام باغ، ص ۵۵

۱۵۔ سفیر حیدر، سیّد: قیدی پرندوں کا اضطراب، (مرزا اطہر بیگ، غلام باغ) غیر مطبوعہ، مملوکہ: سید سفیر حیدر، ص ۳

۱۶۔ اطہر بیگ، مرزا: غلام باغ، ص ۶۷

۱۷۔ غلام باغ، ص ۲۴۰۔۲۳۸

۱۸۔ غلام باغ، ص ۱۳۰

۱۹۔ غلام باغ، ص ۱۳۸

20- Razi Abadi: Writer Bloc: "Theatre of the Absurd", The nation, sunday May 6, 2007, P:9.

۲۱۔ قیدی پرندوں کا اضطراب، ص ۷
۲۲۔ قیدی پرندوں کا اضطراب، ص ۴
۲۳۔ غلام باغ، ص ۶۲۸
۲۴۔ غلام باغ، ص ۶۲۸
۲۵۔ غلام باغ، ص ۹
۲۶۔ غلام باغ، ص ۸۷۸
۲۷۔ قیدی پرندوں کا اضطراب، ص ۸
۲۸۔ غلام باغ، ص ۱۷
۲۹۔ غلام باغ، ص ۱۸
۳۰۔ غلام باغ، ص ۳۱
۳۱۔ غلام باغ، ص ۶۴۶
۳۲۔ غلام باغ، ص ۱۷۰-۱۶۹۔
۳۳۔ غلام باغ، ص ۱۷۱
۳۴۔ غلام باغ، ص ۴۸۲
۳۵۔ غلام باغ، ص ۴۳۲
۳۶۔ غلام باغ، ص ۴۳۳
۳۷۔ غلام باغ، ص ۴۳۵
۳۸۔ غلام باغ، ص ۵۳۲
۳۹۔ سعادت سعید: ''غلام باغ سے آزادی؟ کبیر مہدی کا المیہ!''، مشمولہ: ادبی مجلّہ راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳
۴۰۔ غلام باغ، ص ۳۷